فکرِ اقبال کا ماخذ......قرآنِ کریم

ڈاکٹر محمد اکرم چودھری

حضرت علامہ اقبال نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بھرپور شاعری کی۔ غزل اور خاص طور پر پابند نظم کی متعدد اصناف کو اوجِ کمال تک پہنچایا۔ حضرت علامہ کی مختصر زندگی میں شاعری کا زمانہ تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے جسے ناقدین ان کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے مختلف ادوار میں بانٹتے ہیں، جو ہمارا موضوع نہیں ہے۔

علامہ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی، جو زیادہ تر روایتی اور غزل کے کلاسیکی انداز سے عبارت ہے، تاہم یہ آغاز بھی بڑے بڑے شعرا کے عروج کی شاعری سے کہیں بہتر دکھائی دیتا ہے۔ یہی ایک بڑے شاعر کا وصف ہے کہ آغاز ہی میں فن اور مہارت کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ حضرت علامہ نے جلد ہی غزل سے نظم کی طرف سفر کیا اور ہمالہ جیسی نظم لکھی۔ قومی اور ملی شعور حضرت اقبال کے یہاں شروع ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ شان دار ماضی کے زوال کا غم، مسلمانوں کی زبوں حالی، ابنائے وطن کو لگے ادبار اور جہالت کی بیماری اور نوآبادکاروں (colonial powers) کی دنیا میں من مانی نے اقبال کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔

اسلامی تاریخ، مسلمانوں کے علمی ورثے، اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی، مسلمانوں کی فکری تحریکوں، مغربی تہذیب کے socio-cultural dynamics اور مغرب کے فلسفے کے عمیق مطالعے نے حضرت علامہ کو قرآن کریم کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔

کسی کتاب یا مصنف سے شعوری طور پر متاثر ہونا ایک بات ہے اور اسے تحت الشعور کے اندر جذب کرنا دوسری بات۔ تحت الشعور کی سطح پر کسی کتاب یا انسان کا اثر جب جزوِ شخصیت بن جاتا ہے تو یہ اثر قبول کرنے والے کے اندازِ فکر و نظر کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے تو اسی زاویہ نگاہ سے اور دیکھتا ہے تو اسی عینک سے۔ اس کے سانچے اور پیمانے اور حسن و قبح اور خوب ناخوب کے معیار بھی اسی منبع فیضان سے برآمد ہوتے ہیں اور اگر وہ شاعر اور ادیب ہے تو اس کا نظریہ شعر، اس کی لفظیات، اس کا اسلوب، اس کی علامتیں

اور اس کے استعارے بھی اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ قرآن کے ساتھ اقبال کا تعلق اسی نوع کا ہے۔[۱]

ہماری تاریخ میں قرآنی مطالب کو السنہ شرقیہ میں نثر اور نظم دونوں صورتوں میں پیش کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ مولانا روم کی مثنوی معنوی کو قرآن درزبان پہلوی کہا گیا۔ ہر چند قرآن کریم کے باقاعدہ ترجمے کا کام اسلامی تاریخ کے پہلے ساڑھے گیارہ سو سال تک نہیں ہوا اور اولین تراجم میں سورۃ یوسف کا پنجابی زبان میں ترجمہ اور سورۃ یوسف کی منظوم پنجابی تفسیر، حافظ برخوردار رانجھا (متوفی ۱۷۵۸ء) نے کی،[۲] اور پہلا فارسی ترجمہ، کیونکہ اس وقت برصغیر میں فارسی ہی علمی زبان تھی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۷۶۲ء) نے کیا۔ بہت سے صلحاء اور دردمند مسلمانوں نے چیدہ چیدہ آیات قرآنی کے منظوم اردو تراجم کیے، جنھیں تداول بھی نصیب ہوا۔ اس ضمن میں بہت شاندار، مگر مختصر تذکرہ محترم بریگیڈیر حامد سعید اختر نے اپنے بیش قیمت مضمون 'قرآن اور اقبال' میں پیش کیا ہے، جو اقبال اکادمی پاکستان کے مجلّے اقبالیات کے شمارے جنوری-مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔[۳] قرآنی آیات، مثلاً: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ۔ (سورہ رعد:۱۱) [ترجمہ: اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے] اور قرآنی آیت: یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِئُوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ (سورہ توبہ:۳۲) [ترجمہ: یہ (کفار) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں] مشہور اشعار میں صورت میں ہماری زبان پر ہیں۔

حضرت علامہ نے قرآنی متن کا براہ راست منظوم یا منثور ترجمہ نہیں کیا، شاید اس لیے کہ حضرت علامہ اقبال کے نزدیک قرآن محض ایک کتاب نہیں، بلکہ الکتاب ہے۔ اقبال کائنات میں موجود حکمت و دانائی، نظم و ضبط، ہم آہنگی اور حسن و جمال کو سرودِ ازلی سے تعبیر کرتے ہیں۔[۴] آپ کے یہاں پوری کی پوری کائنات قرآن تکوینی اور مجلد کی صورت میں (ما بین الدفتین) کتاب اللہ، کتاب تدوینی ہے:

آں کتاب زندہ، قرآن حکیم
حکمت او لا یزال است و قدیم[۵]

صد جہاں تازہ در آیات اوست
عصر ھا پیچیدہ در آنات اوست[۶]

چوں بجا در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود[۷]

قرآن کریم وہ زندۂ جاوید کتاب ہے، جس کی حکمت و دانش قدیم بھی ہے اور دائمی و لازوال بھی۔ اس کی آیات کریم میں سیکڑوں نئی دنیاؤں کے بے انتہا امکانات پوشیدہ ہیں اور اس کے آنات و لمحات میں ان گنت صدیاں اور لاتعداد زمانے بند ہیں۔ جب یہ کتاب قلب و جان پر اترتی ہے تو انہیں زیر و زبر کر کے

رکھ دیتی ہے اور جب یہ انقلاب آتا ہے تو آدمی کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

کلامِ اقبال کے عمیق مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبال نے قرآنِ تکوینی پر غور وخوض کے ساتھ ساتھ قرآنِ تدوینی کو اپنے تفکر کا جزو لاینفک بنا لیا تھا۔ بقول غلام رسول ملک: ان کا فکر قرآنی فکر ہے اور ان کی نظر قرآنی نظر ہے اور جب وہ اپنے نتائج فکر ونظر کو الفاظ کا جامہ پہنا لیتے ہیں تو غیر ارادی طور پر قرآنی اسلوب و آہنگ کی شان نمودار ہوتی ہے۔[۸]

کیا تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں بھی حضرت علامہ کا فکری ماخذ قرآن کریم ہی ہے، جس کی بنیاد پر حضرت علامہ فلسفہ دین کی تشکیل نو یا بالفاظ دیگر ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے؟

تشکیل جدید کا بنیادی ماخذ تو قرآن کریم ہی ہے اور وہ علوم وفنون بھی جو اس کتاب حکیم کے مندرجات کی تفہیم کے لیے عصری تقاضوں کے پیش نظر از خود منصۂ شہود پر آ گئے۔ یہ درست ہے کہ خطبات میں مخاطب لوگوں کی رعایت سے حضرت علامہ کو نسبتاً مشکل انداز بیان اختیار کرنا پڑا۔ حضرت علامہ کی آرا اور خطبات کے مندرجات کے بارے میں بے شمار تبصرے کیے گئے ہیں۔

اس ضمن میں محترم ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب خطبات اقبال: تسہیل و تفہیم میں برصغیر کے گذشتہ صدی کے بے شمار مشاہیر کی آرا اور اعتراضات بلاکم وکاست بڑی فراخ دلی کے ساتھ نقل کر دیے ہیں۔ ان میں سے متعدد تنقیدات تو ایسی بھی ہیں جو درحقیقت درخورِ اعتنا بھی نہیں تھیں مگر ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان کو اپنی بلند حوصلگی کے سبب درج کر دیا ہے، علاوہ ازیں دور حاضر کے جید عالم سید حسین نصر اور متعدد مستشرقین کی نکتہ چینی کو بھی من وعن بیان کر دیا ہے۔[۹]

میں ان اعتراضات میں سے صرف دو ایک کا تذکرہ کر کے دوبارہ اپنے موضوع پر آؤں گا۔ میں نے اپنے استاد مکرم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کو ہمیشہ ہی حضرت اقبال کے دیوانہ اور بہت بڑے مداح کے طور پر دیکھا، تاہم اس بات پر وہ ہمیشہ چیں بجبیں رہے کہ حضرت علامہ Intuition اور Revelation میں کوئی qualitative difference نہیں دیکھتے تھے اور ان میں محض quantitative defference کا پایا جانا خیال کرتے تھے۔ گویا وحی اور وجدان میں کیفیت کا اختلاف نہیں ہے۔ صرف کمیت کا اختلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح استاذ محترم فرماتے تھے، اُس طرح حضرت علامہ نے کہیں نہیں لکھا۔ ہاں، البتہ حضرت علامہ اپنے religious experience کے نتائج کو ذریعہ علم کا درجہ ضرور دیتے ہیں۔ میں اپنی کم مائیگی کے سبب استاذ محترم کو کبھی باور نہ کرا سکا کہ ہر مظہر اور phenomenon کی کئی ایک dimensions ہو سکتی ہیں۔ اقبال کے ہاں مذہبی تجربہ (Religious Experience) ایک نبی کے یہاں اور ایک صوفی کے یہاں وقوع پذیر تو ہو سکتا ہے، مگر دونوں کے تجربات Identical نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

صاحب کو پیش آمدہ التباس کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر فاروقی کی نگاہ میں اقبال کے خیالات میں الجھاؤ کا سبب پیغمبرانہ وحی کو صوفیانہ واردات اور شاعرانہ القا پر قیاس کرنے سے پیدا ہوا، لیکن ان کا اعتراض درست نہیں۔ اقبال وحی، کشف اور القا کو ان معنوں میں مذہبی تجربہ قرار دیتے ہیں کہ اس علم سے انسان کی حقیقت مطلقہ تک رسائی ممکن ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ درجات کے اعتبار سے اقبال پیغمبر، ولی اور شاعر کو ایک ہی سطح پر کھڑا دیکھتے ہیں، قطعی غلط ہے۔[۱۰]

دوسرا اعتراض، جو الطاف احمد اعظمی نے پانچویں خطبے، اسلامی ثقافت کی روح (The spirit of Muslim Culture) پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا۔ حضرت علامہ نے واقعہ معراج پر شاہ جہاں کے زمانے کے مشہور صوفی حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا یہ ارشاد نقل کیا تھا:[۱۱]

> Muhammad of Arabir ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned.[12]

ترجمہ: محمد عربی ﷺ آسمان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئے اور واپس آ گئے۔ خدا کی قسم! اگر میں اس بلندی تک گیا ہوتا تو کبھی زمین پر واپس نہ آتا۔[۱۳]

اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے الطاف احمد اعظمی حضرت علامہ کے ماحصل کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ایک پیغمبر اور صوفی کے شعوری تجربے میں نفسیاتی اعتبار سے جو فرق ہے، وہ عبدالقدوس گنگوہی کے مذکورہ الفاظ سے بالکل واضح ہے۔ صوفی روحانی تجربے کی جن بلندیوں تک پہنچتا ہے اور وہاں فراغ خاطر کی جس نعمت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، اس حالت اور مقام سے وہ کبھی جدا ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف پیغمبر روحانی تجربے کی انتہائی بلندیوں تک جانے کے باوجود واپس آتا ہے اور اس کی یہ واپسی تمام تر تخلیقی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کا پیغام انقلاب انگیز ہوتا ہے، وہ تاریخ کا رخ بدلتا ہے اور دنیا کو نئے تصورات سے آشنا کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے روحانی تجربے کو اپنے ایک زندہ اور متحرک عالم گیر قوت میں تبدیل کرے......الطاف احمد اعظمی مزید لکھتے ہیں کہ اس تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک روحانی اعتبار سے نبی اور ولی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ فرق جو ہے، وہ نفسیاتی اعتبار سے ہے، یعنی ولی کا روحانی تجربہ انفرادی نوعیت کا ہے۔ جب کہ نبی کا روحانی تجربہ غیر انفرادی اور عالم گیر ہوتا ہے۔[۱۴]

اعظمی صاحب کے اعتراض ہی میں خود جواب بھی شامل ہے۔ حضرت علامہ ایک نبی اور صوفی کے بنیادی وظیفے کے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک صوفی کے لیے حقیقت مطلقہ سے اتحاد اور ملن اس کے لیے آخری منزل ہے، مگر انبیا اپنے روحانی تجربے کو عالم گیر وقت کی شکل عطا کر کے اسے social phenomena بناتے ہیں۔ نبی اس منزل سے واپسی پر عامۃ الناس کے ساتھ محلوں اور آبادیوں میں رہتا

ہے اور اپنے آپ کو ایک ماڈل کے طور پر پیش کرتا ہے اور پھر اپنے conduct اور طریقہ حیات کے بارے میں لوگوں سے فقد لبثت فیکم عمرا (سورۃ یونس: ۱۶) کہہ کر تصدیق طلب کرتا ہے کہ میری تعلیمات قابل عمل ہیں، گویا نبی کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے، خود اسے demonstrate کر کے دکھاتا ہے۔ اسی لیے اقبال اسلام کی آمد کو Inductive Intellect کا ظہور قرار دیتے ہیں۔

الطاف احمد اعظمی، اقبال پر ایک اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ عربی میں ان کی استعداد ناکافی تھی، یہ اعتراض اس لیے بھی غلط ہے کہ یورپ جانے سے قبل اقبال چار سال تک پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ یورپی یونیورسٹیوں میں مستشرقین کے ساتھ عربی زبان کے استاد رہے۔ پوسٹ گریجویٹ سطح پر عربی زبان و ادب کے معلم کو عربی زبان سے نابلد قرار دینا، اعتراض برائے اعتراض کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت علامہ کے بارے میں ایک بہت بڑی شخصیت کا comment، جو میرے لیے ہمیشہ ہی حیرت کا باعث رہا، وہ حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان ہے، جو سب سے پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے مجلّہ جوہر کے شمارہ مئی- جون ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہ کی وفات کے فوراً بعد چھپا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں ہفت روزہ ایشیا میں چھپا تھا اور اسی پرچے کے نومبر ۲۰۱۲ء کے ایک شمارے میں دوبارہ سامنے آیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے۔ عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود ان کی افتادِ طبع کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے میلانات تھے۔ جن کی بنا پر اپنی رِندی کے اشتہار دینے میں انھیں کچھ مزہ آتا تھا، ورنہ درحقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاص شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، مگر اخیر زمانے میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کے دوران روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑی خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے، مگر چھپ کر، ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ میں نرا گفتار کا غازی ہوں۔[۱۵]

پھر مولانا، اقبال کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

اقبال بڑا اُپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا[۱۶]

حیران کن بات ہے کہ وہ فلسفی شاعر، جسے ہمیشہ ہی vitalist اور قوت پرست کہا گیا ہے، جو امت مسلمہ کی عروق مردہ میں زندگی کے خون کی روانی اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے تڑپتا رہا، مولانا نے

اس میں ملامتیہ میلانات کیسے ڈھونڈ لیے۔ میری رائے میں مولانا کو اقبال کی کسرِ نفسی اور فروتنی کے اظہار سے شاید یہ مغالطہ ہوا ہے اور مولانا نے یہاں poetic stair کے احتمال کو بھی نظر انداز فرما دیا۔

قرآن کریم سے اقبال کے شغف کی جڑیں تلاش کرنا ہوں تو ان کی زندگی کا ہر لمحہ گواہ ہے کہ وہ ہمیشہ قرآن ہی کے جلو میں چلے۔ انھوں نے بہت بچپن ہی میں محسوس کر لیا کہ گویا قرآن ان کے اپنے قلب پر اتر رہا ہے اور جب اقبال کے قلب پر قرآن باقاعدہ نازل ہونے لگا تو وہ کہہ اٹھے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف[۱۷]

جب اقبال نے فکری زندگی میں بلوغت حاصل کی اور انھیں احساس ہوا کہ اب وہ زندگی کے اسرار کو سمجھنے کے، کسی حد تک، اہل ہیں تو خود ان کا دل بول اٹھا کہ وہ دانش، جو قرآن کے سراج منیر سے فیض حاصل نہیں کرتی،، ناقص ہے اور اس لیے ناقص ہے کہ وہ دانش محدود ذہن اور فانی فکر رکھنے والے فانی وجود کی سوچ ہے۔ اولادِ آدم کی ہم جہتی اور فلاح فقط قرآنی ہدایت ہی کی مدد سے ممکن ہے۔[۱۸] اسی کامل یقین کی بنا پر ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرارِ خودی میں بحضور رسالت مآب ﷺ التجا پیش کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اور امت محمدیہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، وہ قرآن کی روشنی میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اپنے لیے رسول اللہ کے حضور خود تجویز کرتے ہیں:

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیابان راز خارم پاک کن
تنگ کن رخت حیات اندر برم
اہل ملت را نگہدار از شرم
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا[۱۹]

ترجمہ: اگر میرا دل جوہر آبدار نہیں اور میرے اشعار میں قرآن کے علاوہ کچھ اور تحریر ہے تو اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ میرے فکر کے شرف کا پردہ چاک کر دیجیے اور خیابانِ (دنیا) کو میرے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ میرے افکار کی حرمت ختم کر دیجیے اور اس گلشن کو میرے وجود کے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ لباس زندگی کو مجھ پر تنگ کر دیجیے اور ملت کو میری شاعری کے شر سے محفوظ رکھیے۔ مجھے قیامت کے روز خوار و رسوا کیجیے اور اپنی پابوسی سے محروم رکھیے۔

مظفر حسین لکھتے ہیں کہ اس زوردار اور واشگاف اعلان کے بعد یہ بات محتاج بیان نہیں رہتی کہ علامہ اقبال کے کلام اور فلسفے کو سمجھنے کے لیے قرآن سے رجوع کس قدر ضروری ہے۔ چونکہ قرآن ہی علامہ اقبال کے افکار و نظریات کا اصل جوہر ہے، اس لیے فکرِ اقبال کے فہم کی بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ ان خیالات و افکار کے اصل سرچشمے، یعنی قرآن کی طرف رجوع کیا جائے۔ ......ہمیں علامہ اقبال کی فکر کو قرآن اور اسلامی روایات ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس سے ہٹ کر جو کوشش بھی ہوگی، وہ ہمیں کسی اور ہی سمت میں لے جائے گی، جو علامہ اقبال کا مقصود نہیں۔[۲۰]

۱۹۲۷ء میں اقبال نے زبورِ عجم میں بھی اپنی اس روش کا اعادہ کیا۔ فرماتے ہیں:

نہ پنداری کہ من بے بادے مستم
مثال شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست
بہ جبریل امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم[۲۱]

ترجمہ: یہ نہ سمجھ کہ میں بغیر شراب کے مست ہوں اور شاعروں کی مانند محض افسانہ گوئی کر رہا ہوں، میں تو جبریل امیں کا ہم داستاں ہوں۔ میرا کوئی رقیب، قاصد یا دربان نہیں [بلکہ میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیض یاب ہوں] ظاہر ہے، وہ داستان جو حضرت جبریل نے سنائی تھی، وہ قرآن کریم تھا۔

اقبال کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں بلاواسطہ طور پر، کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے اور شاید ہی کوئی شعر یا نظم ایسی ہو، جس میں بالواسطہ طور پر قرآن، سنت یا تاریخ اسلام کا تذکرہ نہ ہو۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ[۲۲]

ترجمہ: اپنے دل کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے اور عمل سے اپنے عشق کی عزت و وقار میں اضافہ کر لے۔

یہ قلب و ضمیر کو اللہ کے رنگ میں رنگنا صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً (سورۃ بقرہ: ۱۳۸) [ترجمہ: رنگ اللہ کا چاہیے، اس سے زیادہ حسین و جمیل رنگ اور کیا ہوسکتا ہے] اور یہ اللہ کے نور سے دیکھنا کہ جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے ابن کثیر کی روایت کردہ ایک حدیث کے مطابق ارشاد فرمایا: مومن کی فراست سے ڈرو، اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔[۲۳]

ایک مجلس میں ایف سی کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے اقبال سے پوچھا کہ تم جیسا پڑھا لکھا

آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن لفظ و معانی کے ساتھ محمد ﷺ پر نازل ہوتا تھا؟ اقبال نے جواب دیا کہ یہ یقین کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ میرا تجربہ ہے۔ مجھ پر پورا شعر اترتا ہے تو پیغمبر پر پوری عبارت کیوں نہیں اتری ہوگی۔[۲۴]

قرآن سے استفادے کی صورتیں

کلام اقبال میں قرآن سے استفادے کی تین صورتیں ہیں: اول: قرآنی آیات یا ان کے اجزا کو نظم کرنا، دوم: قرآنی مفاہیم کا براہ راست استعمال اور سوم: قرآنی مفاہیم سے اخذ و اکتساب۔

سب سے پہلے اقبال کے کلام میں قرآنی آیات یا ان کے اجزا کو دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اردو اور فارسی کلام سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

جواب شکوہ کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے، جس میں قوت عشق سے دنیا کو زیروزبر کرنے اور زمانے میں اسم محمد سے اجالا کرنے کا پیغام دیتے ہوئے اقبال سورۃ انشراح کی چوتھی آیت کے ذریعے اپنے خیال کو یوں منور کرتے ہیں:

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ 'رَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ' دیکھے[۲۵]

ضرب کلیم کی ایک نظم لاہور و کراچی، میں مسلمانوں کو اللہ پہ نظر رکھنے اور غیر اللہ سے منہ موڑنے کا درس دیتے ہوئے اقبال نے سورۃ قصص کی آیت ۸۸ کا ایک حصہ نظم کیا ہے۔ دیکھیے:

آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ 'لَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً آخَر'[۲۶]

اردو اشعار کی طرح اقبال نے فارسی کلام میں بھی قرآن سے براہ راست استفادے کا سلسلہ جاری رکھا۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۶۲ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ۝

اقبال آیت ربانی کے مختلف الفاظ کو یوں استعمال کرتے ہیں کہ ہر جگہ ایک طرف آیات کی تفہیمی سطح بلند ہوتی ہے اور دوسری جانب خود اقبال کے اشعار جگمگا اٹھتے ہیں۔ رموزِ خودی کے ایک شعر اور بالِ جبریل کی ایک رباعی سماعت فرمائیے:

قوت ایماں حیات افزایدت
وردِ لا خوف علیھم بایدت[۲۷]

عطا اسلاف کا جذبِ دُروں کر
شریکِ زمرۂ 'لَا یَحزَنُوں' کر
خرد کی گُتھیاں سُلجھا چُکا مَیں
مرے مَولا مجھے صاحِب جُنوں کر![۲۸]

سورۃ آل عمران کی آیت ۹۲ (لن تنالوا البر حتی تنفقوا) کے دو الفاظ کو اقبال نے اسرارِ خودی کے ایک شعر میں اس خوبی سے باندھا ہے کہ شعر کی قرأت میں دو زبانوں کے صوتی امتیازات کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اقبال کہتے ہیں:

دل ز حتی تنفقوا محکم کند
زر فزائد الفت زر کم کند[۲۹]

بعض اوقات اقبال کسی مصرع کو ایک آیت سے بھی مزین کر دیتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ وہ مصرع بحر و قوافی کے اعتبار سے قطعاً اجنبی دکھائی نہیں دیتا۔ جاوید نامہ میں فلک قمر کے آخری بند کا شعر ملاحظہ فرمایئے اور داد دیجیے کہ ایک فارسی مصرع اور دوسرا عربی اور وہ بھی قرآنی زبان میں، لیکن مجال ہے کہ شاعرانہ حسن یا حسن خیال پر کوئی گرد پڑی ہو:

صرصری دہ با ہوائے بادیہ
انھم اعجاز نخل خاویہ[۳۰]

اقبال کا فن شاعری پر دسترس کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے بعض ظریفانہ اشعار کو مزید پر اثر بنانے کے لیے بھی مناسب مواقع پر قرآنی آیت سے خوب خوب استفادہ کیا ہے، مثلاً سرمایہ داروں اور اشترا کیوں کے مابین کشمکش کو واضح کرنے کے لیے تین اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کے دوسرے شعر میں سورۃ یونس کی آیت ۵۱ اور تیسرے شعر میں سورۃ انبیا کی آیت ۹۶ میں ایک لفظ کو بھرپور انداز میں استعمال کیا ہے:

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خُون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا، وَقَدْ کُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ،
کُھل گئے، یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ 'یَنْسِلُوْنَ'[۳۱]

اقبال کبھی مختلف سورتوں کے نام لے کران کے مفاہیم مراد لیتے ہیں، جیسے:

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمّس کی تفسیریں ہیں[۳۲]

طلسمِ ظلمتِ شب سُورۂ والنُور سے توڑا
اندھیرے میں اُڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا[۳۳]

اور کبھی مکمل، نامکمل آیات اور کبھی محض آیت کے کسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن سے اپنے فکر کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں محض چند آیات اور اس کے الفاظ درج کیے جاتے ہیں: لا یخلف المیعاد، (سورہ آل عمران:۹)،لیس للانسان الا ماسعی (سورۃ والنجم:۳۹)،لا تخف (سورۃ طٰہٰ:۶۸)،لا تذر (سورۃ نوح: ۲۶)، لا تقنطوا (سورۃ زمر:۵۳)، قل العفو (سورۃ بقرہ: ۲۱۹)، یوم نحس مستمر (سورۃ قمر:۲۶)،اتی الرحمن عبداً (سورۃ مریم:۹۳)

اقبال کی شاعری میں قرآن سے استفادے کی دوسری صورت قرآنی مفاہیم کا براہ راست استعمال ہے۔اقبال کی شاعری کا اکثر حصہ قرآنی مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے، لیکن بعض اشعار مفاہیم قرآن سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں، مثلاً سورۃ فتح کی آخری آیت میں ارشاد ربانی ہے:

مُحَمَّد رسول اللّٰہ، والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم

ترجمہ: محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی جو ہیں، وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل۔

اقبال نے اس آیہ مبارکہ کو مختلف مقامات پر زیرِ نظر رکھا اور چار مقامات پر مختلف انداز میں اس سے اپنے مضمون کو مزین کیا۔ ملاحظہ فرمائیے چاروں اشعار:

نرم دمِ گُفتگو، گرم دمِ جُستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز[۳۴]

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن[۳۵]

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو، وہ شبنم
دریاؤں کے دِل جس سے دہل جائیں، وہ طوفان[۳۶]

مَصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا[۳۷]

ایک اور شعر دیکھیے، جس میں سورۃ انفال کی آیت ۱۷ (وما رمیت اذ رمیت ولکن الله رمی) کے مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکُشا، کارساز[۳۸]

یا سورۃ رحمٰن کی آیت ۲۶ کے مفہوم............ کل من علیھا فان............کو اس شعر میں ملاحظہ کیجیے۔

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کُہن ہو کہ نَو، منزلِ آخر فنا[۳۹]

قرآن سے استفادے کی تیسری صورت قرآنی مفاہیم سے اخذ و اکتساب ہے۔ ایسی صورت میں وہ قرآنی آیات کا ہو بہو مفہوم دینے کے بجائے اپنے موضوع سے متعلق واقعے کو چن لیتے ہیں، جس کے ذریعے وہ اپنے خیال کو تقویت دیتے ہیں۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جو اگرچہ قرآنی مطالب کے براہ راست حامل نہیں ہیں، لیکن ان اشعار کی دل کشی میں قرآنی واقعات و قصص کا وافر حصہ ہے۔

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو[۴۰]

اے شمع! انتہائے فریبِ خیال دیکھ
مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ[۴۱]

کُنویں میں تُو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے[۴۲]

جلوۂ یوسفِ گُم گشتہ دِکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خُونِ زلیخا کر دیں[۴۳]

پروانے کو چراغ ہے، بُلبل کو پُھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس[۴۴]

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات[۴۵]

وہ سکُوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہُوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ[۴۶]

خُونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی مُوسیٰ طلسمِ سامری[۴۷]

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر[۴۸]

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہَوس چُھپ چُھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں[۴۹]

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی[۵۰]

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ مَیں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ[۵۱]

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سِکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی[۵۲]

رہے ہیں، اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا[۵۳]

کب تلک طُور پہ دریُوزہ گری مثلِ کلیم
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر[۵۴]

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنُوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز[۵۵]

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں[۵۶]

قلندر جُز دو حرفِ لا اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لُغت ہائے حجازی کا[۵۷]

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے[۵۸]

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ[۵۹]

وہ علم اپنے بُتوں کا ہے آپ ابراہیم
کِیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم[۶۰]

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم[۶۱]

رِشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہَمن کا طِلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد[۶۲]

کُھلتے نہیں اس قُلزُمِ خاموش کے اسرار
جب تک تُو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے[۶۳]

خشک سازد ہیبت او نیل را
می بد از مصر اسرائیل را[۶۴]

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پُھوٹے
خودی میں ڈُوب کے ضربِ کلیم پیدا کر[۶۵]

یہی ہے سِرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہَوائے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز![۶۶]

❁....❁....❁

حواشی و حوالہ جات

۱- غلام رسول ملک، سرودِ سحر آفریں، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۳۔
۲- خالد، جاوید اقبال، ''حافظ برخوردار رانجھا: حیاتی فن تے فکر''، مقالہ برائے پی ایچ ڈی پنجابی، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ۲۰۰۲ء۔ ص ۵۳۳۔
۳- بحوالہ حامد سعید اختر، ''قرآن اور اقبال''، مطبوعہ اقبالیات، جنوری-مارچ ۲۰۰۲ء۔
۴- غلام رسول ملک، سرودِ سحر آفریں، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۴۔
۵- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۱۲۱۔
۶- ایضاً، ص ۶۴۱۔
۷- ایضاً، ص ۶۶۹۔
۸- غلام رسول ملک، سرودِ سحر آفریں، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۴۔
۹- ڈاکٹر جاوید اقبال، خطباتِ اقبال: تسہیل و تفہیم، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۵-۲۵۔
۱۰- ایضاً، ص ۴۷-۴۸۔
۱۱- مرحوم سید نذیر نیازی نے اپنے ترجمے میں یہ الفاظ لکھے ہیں: محمد عربی برفلك الافلاك رفت و باز آمد، واللہ اگر من رفتے ہرگز باز نیامدے، دراصل یہ الفاظ ممتاز صوفی ابوسلیمان الدارانی (متوفی: ۲۱۵ھ) کے ہیں، جو اس طرح ہیں: لو وصلوا ما رجعوا۔ خود سید نذیر نیازی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ انھیں حضرت گنگوہی کے اصل الفاظ نہیں ملے۔ انھوں نے انگریزی الفاظ کا فارسی میں محض ترجمہ کیا ہے۔ جب کہ اعجاز الحق نے محولہ بالا اصل الفاظ بھی درج کر دیے ہیں، جن کا حضرت گنگوہی نے ابوسلیمان الدارانی کے محولہ بالا عربی الفاظ سے اکتساب کیا۔ (وحید عشرت: تجدید فکریاتِ اسلام۔ لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، دوم)
12- Iqbal, Muhmmad: *The Reconstruction of Religious Thought in Islam,* Ed by M. Saeed Shaikh, p-99.
۱۳- بحوالہ الطاف احمد اعظمی، خطباتِ اقبال: ایک مطالعہ، لاہور: دار التذکیر، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۱۔
۱۴- ایضاً، ص ۱۸۱-۱۸۲۔
۱۵- مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: ''حیاتِ اقبال کا سبق''؛ سید ابوالاعلیٰ۔ مطبوعہ ہفت روزہ، ایشیا، لاہور، ۱۵/نومبر تا ۲۱/نومبر ۲۰۱۲ء۔
۱۶- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۳۲۴۔
۱۷- ایضاً، ص ۴۰۲۔
۱۸- محمد منور، پروفیسر: مقامِ قرآن، علامہ اقبال کی نظر میں، مشمولہ، محور، ۱۹۷۲ء-۱۹۷۳ء، ص ۳۰۔
۱۹- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۱۶۸۔
۲۰- مظفر حسین، اساسِ فکرِ اقبال، لاہور: آل پاکستان اسلامک ایجوکیشنل کانگرس، س ن۔ ص ۶۲-۶۳، ۶۸۔
۲۱- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۵۳۸۔
۲۲- ایضاً، ص ۶۲۔
۲۳- غلام رسول ملک، سرودِ سحر آفریں، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۴۔

۲۴- فقیر سید وحید الدین، روز گارِ فقیر، لاہور، ۱۹۶۶ء۔ ص ۲۱، ۲۲۔
۲۵- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۲۳۶۔
۲۶- ایضاً، ص ۵۶۹۔
۲۷- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۹۵۔
۲۸- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۴۱۲۔
۲۹- ایضاً، ص ۴۳۔
۳۰- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۶۴۴۔
۳۱- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۳۲۲۔
۳۲- ایضاً، ص ۸۶۔
۳۳- ایضاً، ص ۸۸۔
۳۴- ایضاً، ص ۴۲۴۔
۳۵- ایضاً، ص ۵۵۸۔
۳۶- ایضاً، ص ۵۷۳۔
۳۷- ایضاً، ص ۳۰۴۔
۳۸- ایضاً، ص ۴۲۴۔
۳۹- ایضاً، ص ۴۲۰۔
۴۰- ایضاً، ص ۲۳۲۔
۴۱- ایضاً، ص ۷۷۔
۴۲- ایضاً، ص ۱۰۱۔
۴۳- ایضاً، ص ۱۵۸۔
۴۴- ایضاً، ص ۲۵۳۔
۴۵- ایضاً، ص ۲۷۸۔
۴۶- ایضاً، ص ۲۸۶۔
۴۷- ایضاً، ص ۲۹۰۔
۴۸- ایضاً، ص ۲۹۵۔
۴۹- ایضاً، ص ۳۰۲۔
۵۰- ایضاً، ص ۳۱۰۔
۵۱- ایضاً، ص ۳۹۱۔
۵۲- ایضاً، ص ۳۵۳۔
۵۳- ایضاً، ص ۳۶۲۔
۵۴- ایضاً، ص ۳۱۱۔
۵۵- ایضاً، ص ۳۶۳۔
۵۶- ایضاً، ص ۳۶۴۔

۵۷- ایضاً، ص ۳۶۸۔
۵۸- ایضاً، ص ۳۹۵۔
۵۹- ایضاً، ص ۵۲۷۔
۶۰- ایضاً، ص ۵۳۸۔
۶۱- ایضاً، ص ۳۸۹۔
۶۲- ایضاً، ص ۳۹۶۔
۶۳- ایضاً، ص ۴۹۷۔
۶۴- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (فارسی)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۴۵۔
۶۵- علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص ۵۰۳۔
۶۶- ایضاً، ص ۵۸۹۔